© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انبیائے کرام علیہم السلام جس طرح لوگوں کو مخاطب کرنے میں ایک خاص ترتیب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ترتیب تبلیغ و دعوت کی ایک بہت بڑی حکمت پر مبنی ہوتی ہے جو اس ترتیب کو الٹ دینے کی صورت میں، جیسا کہ ہم اس سلسلہ کی کئی پچھلی قسطوں میں بیان کر چکے ہیں، مفقود ہو جاتی ہے اسی طرح جن باتوں کو انبیائے کرام پیش کرتے ہیں ان کو پیش کرنے میں بھی وہ ایک خاص تدریج کا اہتمام کرتے ہیں اور وہ تدریج بھی دعوتِ دین میں ایسی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ نہ صرف ساری محنت اکارت ہو کے رہ جائے، بلکہ اس کا بھی اندیشہ ہے کہ اس سے الٹے دعوتِ دین کے مقصد کو نقصان پہنچ جائے۔ اس وجہ سے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جس طرح ہم نے تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ تبلیغ دین کے لیے لوگوں کو مخاطب کرنے میں کیا ترتیب اختیار کی جائے اسی طرح تفصیل کے ساتھ یہ بات بھی بیان کر دیں کہ دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں کیا تدریج ملحوظ رکھی جائے۔

بظاہر تو یہ ایک واضح سی بات معلوم ہوتی ہے جس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہے حقیقت میں یہ عام طور پر مخفی اور اس کے مخفی ہونے ہی کی وجہ سے بسا اوقات لوگ ہم پر ایسے اعتراضات کر جاتے ہیں جن کا کوئی موقع نہیں ہوتا مثلاً بہت سے لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ ہم توحید و رسالت کے اصولی مسائل ہی پر جتنا زور دیتے ہیں اتنا لوگوں کی وضع قطع اسلامی بنانے پر زور نہیں دیتے۔ اور ہماری اسی بے پروائی کا نتیجہ ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان لباس، ڈاڑھی، وضع و ہیئت اور آداب زندگی میں اہلِ تقویٰ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

متشرعین کے معیار پر نہیں ہیں بلکہ اس طرح کے امور میں ان میں عام طور پر غفلت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرا گروہ ہم پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ تم لوگ اقامتِ دین کا مقصد لے کر اٹھے ہو تو صرف توحید اور رسالت کے وعظ پر کیوں قانع ہو گئے ہو!۔ تمام معاشرت و سیاست اور کاروبار میں اسلامی قوانین ہی کی پابندی کیوں نہیں کرتے؟ ہر حرام و ناجائز سے اجتناب کلی کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ اپنے اندر اسلامی حدود و تعزیرات کیوں نہیں جاری کرتے؟ طاغوت سے عملاً ٹکر لینے کے لیے سبقت کیوں نہیں کرتے؟ یہ اور اس قبیل کے بہت سے اعتراضات ہمارے مخالفین اور موافقین کی طرف سے اکثر آتے رہتے ہیں۔ مخالفین کی نکتہ چینیوں کو تو ہم زیادہ اہمیت نہیں دیتے کیونکہ یہ حضرات اس طرح کے اعتراضات محض اس لیے تراشتے رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی غلط زندگی کو صحیح ثابت کر دیں اور ہماری نسبت لوگوں میں کچھ بدگمانیاں پیدا کر دیں۔ ان لوگوں کی ذہنیت بالکل وہی ہے جو حضرت مسیحؑ کے ان معترضین کی تھی جو ان کی دعوت کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ ان کے شاگرد بغیر ہاتھ دھوئے بھی کبھی کھانا کھا لیتے ہیں اور ان کے توحید کے وعظ پر یہ معارضہ کرتے تھے کہ قیصر کو خراج دینا چاہیے کہ نہیں؟ اس طرح کے نکتہ چینوں کا ایک گروہ ہر دعوتِ حق کے ساتھ جنم لیتا ہے اور اہل فتنہ کو فتنہ میں مبتلا رکھنے کے لیے اپنے "زخرف القول" کے جراثیم لوگوں میں پھیلاتا رہتا ہے۔ ان کے مقابل میں کسی داعیٔ حق کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ صبر کرے لیکن اسی طرح کے اعتراضات بسا اوقات ان لوگوں کی طرف سے بھی آتے ہیں جو ہمارے مقصد کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں اور اس کام میں ان کا دلی تعاون ہمارے ساتھ ہے۔ یہ لوگ اس طرح کے اعتراضات بدنیتی سے نہیں کرتے بلکہ فی الحقیقت وہ بعض اصولی باتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس طرح کے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کا صاف ہونا ضروری ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو ہمارا صحیح موقف نہیں معلوم ہے۔ یہ ہم کو ایک بنی بنائی صالح جماعت کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بار سنبھالنے والی ایک جماعت تصور کرتے ہیں جس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ جماعت کے اندر جس گوشہ میں بھی کوئی فساد دیکھے بڑھ کر اس کی اصلاح کرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جو بات بھی خدا کے قانون کے خلاف پائے اس کو خدا کے قانون کے مطابق کر دے۔ حالانکہ ہماری حیثیت یہ نہیں ہے بلکہ ہماری حیثیت یہ ہے کہ ہم ایک ایسی سرزمین پر دین حق کی دعوت لے کر اٹھے ہیں جہاں نظام حق بالکل درہم برہم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ پر ایک مضبوط نظام باطل نے قائم ہو کر فضا میں اپنی شاخیں اور زمین میں دور تک اپنی جڑیں پھیلا دی ہیں۔ اس طرح کی جماعت کا طریقِ کار قدرتی طور پر سابق الذکر جماعت سے بالکل مختلف ہوگا اور جو لوگ دونوں کے فرق کو نہیں سمجھ رہے ہیں یا غلط فہمی سے دوسری کو پہلی جماعت سمجھ رہے ہیں ان کے ذہن میں التباس کی وجہ سے شبہات پیدا ہی ہوں گے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان حضرات کے ذہن میں اس امر کا کوئی واضح تصور موجود نہیں ہے کہ ایک جماعت جو اس مقصد کے ساتھ اٹھی ہو کر لوگوں کو ایک نظام باطل کے اندر سے کھینچ کھینچ کر نظام حق کی طرف لائے اس کو اپنے مقصد کو پیش کرنے میں تدریج اختیار کرنی پڑتی ہے۔ ان کے نزدیک دین کا ہر کام یکساں اہمیت رکھتا ہے اور جس نقطہ سے بھی دین کی خدمت شروع کر دی جائے دین ہی کی خدمت ہے اور چونکہ اللہ کا پورا دین اترا ہوا، قرآن و حدیث کی صورت میں، لوگوں کے پاس موجود ہے اس وجہ سے یہ خواہش بھی پیدا ہوتی ہے کہ بیک دفعہ پورا دین خود بھی اٹھا لیں اور دوسروں پر بھی لادو دیں۔ نیز چونکہ ان لوگوں کا دینی تصور کچھ بلند نہیں ہے اس وجہ سے اجزائے دین میں سے ان چیزوں پر ان لوگوں کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے جو اگرچہ فلسفہ دین کے اعتبار سے کچھ ایسی اہمیت نہ رکھتے ہوں لیکن چونکہ ایک مدت سے وہ دیندارانہ زندگی کے نمایاں خط و خال سمجھ لیے گئے ہیں اس وجہ سے ان کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے ضروری ہے کہ اس تدریج کو سمجھا جائے جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی دعوت کو پیش کرنے میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ چونکہ انبیاء کی بعثت ایسے زمانہ میں ہوتی ہے جب نظام حق بالکل درہم برہم ہو چکا ہوتا ہے اور ایک جاہلی نظام سوسائٹی کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس وجہ سے وہ سب سے پہلے ان مبادی کی دعوت بلند کرتے ہیں جن کی بنیادوں پر خالص اسلامی سوسائٹی کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ مبادی تین ہیں :-

(۱) خدا پر ایمان، کامل توحید کے ساتھ۔

(۲) رسالت پر ایمان، کامل اطاعت کے ساتھ۔

(۳) آخرت پر ایمان، کامل تفویض کے ساتھ۔

یہی تین چیزیں ہیں جن کے اندر خرابی پیدا ہونے سے سوسائٹی جاہلیت کی طرف کھسکنی شروع ہوتی ہے اور جب ان میں پوری طرح فساد رونما ہو جاتا ہے تو پوری سوسائٹی پر جاہلیت کی ظلمت چھا جاتی ہے اور انہی تینوں چیزوں کے آشکارا ہونے سے سوسائٹی اسلام کی طرف بڑھنا شروع کرتی ہے اور جب یہ پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں تو سوسائٹی پورے دن کی روشنی میں آجاتی ہے۔ ان تینوں چیزوں کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندر اتنا راسخ ہے کہ دنیا میں ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے لیکن چونکہ شیطان کو اچھی طرح پتہ ہے کہ انہی چیزوں پر نظامِ حق کی بنیادیں قائم ہیں اس وجہ سے اس کی ساری کوشش ہمیشہ اس بات کے لیے رہی ہے کہ کسی طرح ان میں کوئی رخنہ ضرور پیدا کرے چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جس طرح ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے اسی طرح شیطان کی کوششوں کا یہ اثر ہے کہ ان کا صحیح صحیح اقرار بھی بہت کم کیا گیا ہے۔ ان عقائد کے باب میں دنیا کی اصلی روش نہ انکار کی رہی ہے نہ ہمیشہ صاف صاف اقرار کی بلکہ بیشتر اقرار مع الانکار کی رہی ہے اور یہی وہ گرہ ہے جو اس رشتہ میں بار بار پڑتی رہی ہے اور اسی کو کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو بھیجا اور کتابیں نازل فرمائیں

اگر معاملہ ان کے انکار کا ہو تو چنداں مشکل نہیں ہے۔ یہ انسانی فطرت کے لیے اپنے اندر اتنی کشش رکھتے ہیں کہ تھوڑی سی جد وجہد سے تمام سلیم الفطرت انسانوں کے اندر ان کا اعتقاد پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن اس معاملہ میں دنیا نے انکار کی روش، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بہت کم اختیار کی ہے بلکہ بیشتر اقرار مع الانکار کی روش اختیار کی ہے اور یہ اقرار مع الانکار دعوت واصلاح کے راستہ کا وہ پتھر ہے جس کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہٹانے کے تصور سے ان لوگوں کا زہرہ آب ہوتا ہے جو اس کے ثقل سے بھی واقف ہیں اور ان سانپوں بچھوؤں اور اژدہوں سے بھی واقف ہیں جو اس کے جنبش میں آتے ہی اس کے نیچے سے سیلاب کے مانند ابل پڑتے ہیں اور ان لوگوں سے چمٹ جاتے ہیں جو اس پتھر کو کھسکانا چاہتے ہیں لیکن انبیائے کرام کو اور ان لوگوں کو جو دنیا کو راہ راست کی دعوت دیتے ہیں بالعموم ایسے ہی فاسد العقیدہ لوگوں سے کشمکش کرنی پڑتی ہے جو باطل کو حق میں ملا کر اس کی پرستش کرتے ہیں اور خدا کے دین اور اپنے نفس کی خواہشوں میں مصالحت کرا کے ایک نیا نظام کھڑا کر لیتے ہیں اور اس کو پرانے نظام کا نام دے دیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اپنے باطل کی حفاظت کے لیے چونکہ حق کو سپر بنائے ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان پر پوری آزادی کے ساتھ بیک دفعہ ضرب نہیں لگائی جا سکتی بلکہ آہستہ آہستہ ان کے اعمال و معتقدات میں سے حق کے اجزاء کو الگ اور باطل کے اجزا کو الگ کرنا پڑتا ہے اور چونکہ ان کا ہر باطل حق بن کر رچ چکا ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی جدائی ان کو اتنی شاق گذرتی ہے کہ وہ ان میں سے ایک ایک پر مورچے قائم کرتے ہیں اور اس وقت تک اس کو نہیں چھوڑتے جب تک اس کی حمایت سے بالکل مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ کام بڑا دیر طلب ہے، اس میں بڑی دیدہ ریزی، بڑے صبر، اور بڑے حلم کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی بے لاگ حق پرستی بھی اس راہ میں مطلوب ہے کیونکہ جن لوگوں کے متعلق آدمی کا خیال یہ ہو کہ ان کے انکار کے ساتھ اقرار بھی شامل ہے، قدرتی طور پر ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ نرمی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس نرمی کا سارا فائدہ باطل کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ حق کو۔

بہرحال مذکورہ بالا بنیادی اصولوں کو مان کر جو لوگ ایک جماعت بن جاتے ہیں ان لوگوں کو انبیائے کرام ان باتوں کی تعلیم شروع کرتے ہیں جن سے ایک طرف تو وہ خدا سے بہتر سے بہتر تعلق پر جڑ جائیں، دوسری طرف آپس میں بالکل مربوط ہو جائیں۔ یہ خدا اور بندوں سے ٹھیک ٹھیک جوڑ دینے والے اصول انہی تین اصولوں سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے اس وجہ سے ان لوگوں کو ان کے قبول کر لینے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی جو ان تینوں اصولوں کو مان چکے ہوں۔ ایک شئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو مان لینے کے بعد کوئی دیانتدار شخص اس کے لوازم کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا کیونکہ ایک شے کے لوازم کی حیثیت تو در حقیقت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوتی ہے۔ لیکن اس تفصیل کو بھی انبیاے کرام مجرد اس اعتماد پر کہ جن لوگوں نے اصول تسلیم کر لیے ہیں وہ لازماً فروع کو بھی مان ہی لیں گے۔ یوں ہی کیف ما اتفق لوگوں کے سامنے پھینکنا نہیں شروع کر دیتے بلکہ ایک حکیمانہ ترتیب و تدریج کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اسی ترتیب و تدریج کے اندر ان کے مشن کی کامیابی کا اصل راز مضمر ہوتا ہے۔ اس ترتیب میں دو پہلو مدنظر ہوتے ہیں ایک جماعت کی ذہنی استعداد کا۔ دوسرا جماعت کی اجتماعی استطاعت کا۔ یہ دونوں چیزیں کسی قدر وضاحت کی محتاج ہیں۔

ذہنی استعداد سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ دین کے احکام و تعلیمات میں ایک نظم (سسٹم) ہے۔ اس کے کچھ بنیادی کلیات ہیں، ان سے کچھ مبادی پیدا ہوتے ہیں، پھر ان سے اصولی تعلیمات پیدا ہوتی ہیں، پھر ان سے جزئیات و فروع وجود میں آتی ہیں۔ جو شخص اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ دین کو سیکھتا ہے وہ ایک طرف تو ہر مرحلہ میں دوسرے مرحلہ کے لیے اپنے اندر استعداد پیدا کر لیتا ہے اور دوسری طرف اس پورے سسٹم سے واقف ہو جاتا ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی مثال بالکل یہ ہے کہ ایک بچہ کو پہلے حروف تہجی کی تعلیم دی جائے۔ پھر ان کو آپس میں جوڑنا اور ملانا سکھایا جائے، پھر اس کو الفاظ اور جملوں کے پڑھنے کی مشق کرائی جائے۔ پھر اس کے سامنے پڑھنے کے لیے ایک پوری عبارت رکھ دی جائے چونکہ وہ حروف سے عبارت تک درجہ بدرجہ اس سسٹم کو سمجھتا ہوا آیا ہے جو اس کے اندر محفوظ ہے اس وجہ سے ہر منزل میں اس نے آگے کی منزل کی استعداد بہم پہنچا لی ہے اور کوئی چیز اس کی طبیعت پر بار نہیں ہوئی ہے بلکہ ہر استعداد چونکہ فطرۃً فعل چاہتی ہے اس وجہ سے اس نے ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں منتقل ہونے کے لیے اپنی طبیعت کے اندر خود ایک تقاضا محسوس کیا ہے۔ اس کے برعکس جس شخص نے دین کو اس طرح نہیں پایا ہے بلکہ اس کے مختلف حصے اس کے سامنے بے ربط و بے ترتیب رکھ دیے گئے ہیں اس کی مثال بالکل اس بچہ کی ہے جس کو تمام ابتدائی مراحل سے گزارے بغیر کوئی عبارت رٹا دی گئی ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس کو وہ رٹ تو لے گا اور حافظہ کی مدد سے دہرا بھی سکے گا لیکن وہ ہمیشہ اس کے حافظہ پر ایک بار ہو گی۔ کبھی اس کی فطری استعداد کا جزو نہیں بن سکے گی۔ انبیائے کرام علیہم السلام دین کو پیش کرنے میں یہ طریقہ کبھی نہیں اختیار کرتے بلکہ فطری اور حکیمانہ ترتیب اختیار کرتے ہیں تاکہ جو لوگ اس کو قبول کریں اپنی طبیعت کی طلب سے قبول کریں اور پورا دین ان کے فکر و نظر اور روح و دل کے اندر جذب ہو جائے اسی چیز سے وہ رسوخ ایمان پیدا ہوتا ہے جو آروں سے چیرڈالے جانے کے بعد بھی دلوں سے نہیں نکلتا اور وہ ذوق تقویٰ پرورش پاتا ہے جو زندگی کے پھیلے ہوئے معاملات کے بعید ترین گوشوں میں بھی کوئی چیز روح دین کے خلاف برداشت نہیں کر سکتا۔

جو لوگ دین کے اس نظام کو اور انبیائے کرام کے اس طریق دعوت کی خوبیوں کو نہیں سمجھے ہیں وہی لوگ ہیں جو معرفت الٰہی پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کو نہ صرف فرض نمازوں کا بلکہ تہجد و اشراق تک کا پابند بنانا چاہتے ہیں۔ جو نبی کی ضرورت اور اس کی اطاعت و پیروی کا اعتقاد پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کی ڈاڑھیوں، لبوں اور پائجاموں کی پیمائش کرتے پھرتے ہیں، جو آخرت پر سچا اور پکا ایمان پیدا کرنے سے پہلے لوگوں پر خشیت، تقویٰ، تواضع اور فروتنی کا جمال دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان الٹی کوششوں سے ایک حد تک یہ ہو تو جاتا ہے کہ ڈاڑھیاں لمبی ہو جاتی ہیں، ازاریں اپنے حد کے اندر آجاتی ہیں، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے ہر چیز میں ایک مصنوعی مسکینی نمایاں ہو جاتی ہے۔ کھانے پینے، کھانسنے اور چھینکنے ہر چیز میں پابندیِ سنت کا التزام و اہتمام پیدا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ یہ سب کچھ غیر عقلی اور غیر فطری طریقہ پر پیدا کیا جاتا ہے اس وجہ سے اس تمام ہمہ تقویٰ کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ "مچھر چھانے جاتے ہیں اور اونٹ نگلے جاتے ہیں"۔ اس طرح کے اتقیاء یہ نہیں دیکھتے کہ جو لقمہ حلق میں جا رہا ہے وہ پاک و طیب ہے یا طاغوت کی خدمت کر کے حاصل کیا گیا ہے لیکن اس امر کا انتہائی اہتمام کرتے ہیں کہ اس لقمہ حرام کو کھانے کے بعد پانی دہنے ہی ہاتھ سے پئیں۔ بائیں ہاتھ سے نہ پئیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا دینی تصور یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی "نیت خالص"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے تو وہ موجودہ نظام باطل کے اندر تھانہ داری، ڈپٹی کمشنری، اور کونسلوں کی ممبری سب کچھ کرکے اللہ کو راضی اور اسلام کے جھنڈے کو اونچا کرسکتا ہے۔ انہی متقیوں کے اندر ہمیں ایسے لوگوں کا بھی پتہ ہے جو اپنی خوش قسمتی پر بہت نازاں ہیں کہ انھیں اپنی لڑکی کے لیے ایسا دیندار بر ملا ہے کہ اس کی ازار ٹخنوں سے کبھی نیچے نہیں ہوتی اور "فلاں حضرت" کا مرید ہے، لیکن ان کی نظر اس بات پر نہیں جاتی کہ اس نے اپنی معاش کے لیے جو ذریعہ اختیار کیا ہے کوئی مسلمان حس ایمانی رکھتے ہوئے اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہ سارا بے تکا پن درحقیقت نتیجہ ہے اس بات کا کہ ایک مدت سے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی دعوت نہیں اٹھی جو ان کے سامنے ان کے پورے دین کو اس کے سسٹم کے ساتھ پیش کرتی اور تبلیغ و دعوت کے ہر مرحلہ میں دین کا جس قدر حصہ لوگوں کو دیتی اس کے پورے مقتضیات ان پر واضح کر دیتی، بلکہ جن لوگوں نے بھی اس سلسلہ میں کوئی کام شروع کیا، ضرورت کا شعور اور نظام دین کی معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جہاں سے چاہا شروع کر دیا اور جہاں چاہا ختم کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مسلمانوں کے اندر کچھ دینی شعور ہے اس قدر اتھلا اور بے جان ہے کہ اس کو کسی صحیح دعوت کے لیے بنیاد بنانا تو درکنار اس کو قائم رکھ کر کوئی صحیح دعوت شاید شروع بھی نہیں کی جاسکتی۔

اب اسی طرح بالاجمال اُس اجتماعی استطاعت کی حقیقت پر غور کیجیے جس کو حضرات انبیائے کرام دین کو پیش کرنے میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ دین کے احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو طرح کے ہیں۔ ایک انفرادی احکام دوسرے اجتماعی احکام۔ انفرادی احکام افراد کے لیے ہوتے ہیں، اور ہر فرد کے لیے اس کی انفرادی حیثیت ہی میں، ان کی تعمیل ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ۔ اجتماعی احکام کا تعلق جماعت سے ہے۔ جب جماعت وجود میں آجائے تو اس کا فرض ہوتا ہے کہ ان کی تعمیل کرے، مثلاً وہ احکام جو معاشرت و سیاست اور جہاد سے متعلق ہیں۔ پہلی قسم کے احکام کی تعلیم و دعوت میں افراد کے تحمل کا لحاظ ہوتا ہے کہ ان پر بارش کی طرح احکام برسا نہ دیے جائیں کہ وہ گھبرا کے سب کچھ چھوڑ بیٹھیں۔ دوسری قسم کے احکام میں جماعت کے تحمل کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس قابل ہے بھی کہ نہیں کہ جو احکام اس کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیے جا رہے ہیں اُن کا بوجھ اٹھا سکے۔ اس جماعتی استطاعت کا لحاظ نہایت ضروری بھی ہے اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہایت مشکل بھی ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کو تو اس معاملہ میں براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ہوتی ہے۔ کیونکہ احکام و قوانین نازل ہی جماعت کی قوت و استعداد کے لحاظ سے ہوتے ہیں، البتہ جو لوگ انبیاء کے طریقہ پر کسی جماعت کو اٹھانا چاہتے ہوں ان کو اس معاملہ میں سرتاسر اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے اور جب تک انھیں احکام دین کی ترتیب نزول، اپنے وقت کے خاص حالات، اور ایک نبی اور غیر نبی کی جماعت کے فرق کا پورا پورا اندازہ نہ ہو، کبھی ان کا قدم صحیح راہ پر نہیں پڑ سکتا اور ہر وقت اس بات کا اندیشہ ہے کہ جس جماعت کی وہ قیادت کر رہے ہیں اس کی کشتی ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی کسی چٹان سے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائے:

جو لوگ اس امر سے واقف نہیں ہیں وہ پورے قرآن مجید کو اپنے سامنے دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پورا کا پورا ایک ہی دن اتار دیا گیا تھا اور اس کے پورے کے پورے کو ایک ہی دن میں جاری و نافذ ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ جو جلد باز ہیں وہ ایک طرف توحید کی دعوت شروع کرتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی نظام قضا کی داغ بیل بھی ڈال دیتے ہیں۔ ایک طرف کفر بالطاغوت کی شرح شروع کرتے ہیں دوسری طرف طاغوت کو الٹی میٹم بھی بھیج دیتے ہیں۔ اور جو حضرات حیلہ باز ہیں اگر ان سے کہیے کہ غیر الٰہی نظام سے تعاون ناجائز ہے تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ ریلیں کیوں استعمال کرتے ہو؟ ڈاک خانوں سے کیوں کام لیتے ہو؟ تار اور ٹیلیفون کا بائیکاٹ کیوں نہیں کرتے؟ اگر ان سے کہیے کہ ہندوستان دار الکفر ہے، اس کو دار الاسلام بنانے کی جدوجہد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے، تو مطالبہ ہوگا کہ پھر یہاں سے ہجرت کیوں نہیں کرتے اور کفار سے جنگ کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟ ان باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کو اس بات کی بالکل خبر نہیں ہے کہ کسی سرزمین کے نظام جاہلی کو نظام اسلامی سے بدل دینے کے لیے جو جدوجہد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اٹھتی ہے اس میں کیا ترتیب و تدریج ہے اور اس ترتیب و تدریج کے اندر کیا حکمتیں اور برکتیں ہیں۔ اور اس میں جماعت کی اجتماعی قدرت و استطاعت کا کس قدر صحیح اندازہ کر کے قدم اٹھانا پڑتا ہے اور اگر اس اندازہ میں ادنیٰ غلطی بھی ہو جائے تو کیا خطرے متصور ہیں؟

یہاں یہ بات بتانے کا موقع ہے اور چنداں اس کی ضرورت ہے کہ قرآن میں معاشرت اور سیاست سے متعلق سارے احکام اس وقت نازل ہوئے ہیں جب کہ دار الاسلام بالفعل قائم ہو چکا ہے۔ اور ان احکام کے نازل ہونے میں بھی ایک ترتیب و تدریج ہے اور یہ ترتیب و تدریج جماعت کی استطاعت سے بالکل متوازی ہے۔ جب مسلمان اتنی تعداد میں ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی ایک علٰحدہ ہیئت اجتماعی کی تشکیل کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انھیں ایک آزاد گوشہ زمین بھی مل جاتا ہے تب انھیں نظام کفر سے قطع تعلق کا آخری حکم دیا جاتا ہے۔ اس طرح جب مسلمانوں کی جماعتی قوت کم از کم اتنی ہو جاتی ہے کہ وہ کفر کے مقابل میں ٹک سکتے ہیں تب انھیں لڑائی کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جب مسلمان اس حیثیت میں ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک مستقل نظام معاشرت و نظام معیشت کو چلا سکیں تب انھیں نظام کفر سے ہر طرح کے سوشل بائیکاٹ کا حکم دیا جاتا ہے اور اسلام کے وہ قوانین و احکام نازل ہوتے ہیں جو مدنی و اجتماعی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ وقت آتا ہے کہ مسلمان وہ سیاسی قوت بہم پہنچا لیتے ہیں کہ بغیر کسی اندیشۂ مزاحمت خدا کی زمین پر خدا کے احکام کو جاری و نافذ کر سکتے ہیں تو ان کو وہ احکام و قوانین دیے جاتے ہیں جن کا تعلق بین الاقوامی سیاست سے ہے۔ ایک طالب علم کی ذہنی استعداد کی طرح ایک جماعت کی مادی استعداد بھی تدریجاً ہی بڑھتی ہے اور جو لوگ کسی جماعت کی قیادت کرتے ہیں ان کو سب سے زیادہ بیدار مغزی کے ساتھ جماعت کی اس استعداد ہی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کا صحیح صحیح اندازہ کیے بغیر جماعت پر کوئی بوجھ ڈال دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو استعداد اس نے ایک مدت میں فراہم کی ہے وہ ساری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ساری برباد ہو جائے گی۔

یہ ساری تفصیل یہ سمجھانے کے لیے پیش کرنی پڑی ہے کہ آج جو دعوت ہم نے شروع کی ہے اس پر بعضوں کو تو یہ اعتراض ہے کہ اس میں سارا زور صرف اصولی مسائل پر ہے جزئیات دین کا اس میں خاص اہتمام نہیں ہے۔ اور دوسرا اعتراض بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ باوجود یہ جماعت مدعی ہے کہ طاغوت کے ساتھ ہر قسم کا تعاون ناجائز ہے لیکن زندگی کے بہت سے گوشوں میں یہ بھی طاغوت کے ساتھ تعاون کر رہی ہے۔ ان دونوں جماعتوں کے سامنے ہم یہ حقیقت لانا چاہتے ہیں کہ آج جو کام ہم کر رہے ہیں وہ کسی بنی بنائی جماعت کے اندر کسی جزوی فساد کی اصلاح کا کام نہیں ہے بلکہ ایک ایسی سرزمین پر نظام حق کو از سر نو برپا کرنے کی دعوت ہے جہاں ایک نظام باطل پوری قوت کے ساتھ جما ہوا ہے۔ ایسی جگہ دعوت حق کا کام انجام دینے کے لیے حضرات انبیائے کرام نے جو نمونہ ہمارے واسطے چھوڑا ہے اس پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پروگرام میں اصولی طور پر دو چیزیں ملحوظ ہونی چاہئیں۔ ایک جماعت کی ذہنی استعداد کا لحاظ، دوسری جماعت کی مادی استطاعت کا لحاظ۔ جب ان دونوں چیزوں میں متوازی اور تدریجی ترقی ہوتی ہے اور ان کی اس تدریجی ترقی ہی کے اعتبار سے ان پر ذمہ داریاں ڈالی جاتی ہیں تو جماعت کا صحیح ارتقاء وجود میں آتا ہے۔ ورنہ جماعت میں یا تو عقلی ضعف پیدا ہو جاتا ہے یا مادی یا دونوں طرح کا اور بالعموم دونوں ہی طرح کا ہوتا ہے کیونکہ ان میں ہر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے۔

© rasailojaraid.com